آراضی ہند کی شرعی حیثیت عہد مغلیہ کے علماء کی نظر میں

(۲)

جناب ظفر الاسلام صاحب شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

اس مضمون کی پہلی قسط[1] میں آراضی ہند کی شرعی حیثیت سے متعلق شیخ جلال الدین تھانیسری کے خیالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ پیش نظر قسط میں اسی موضوع پر قاضی محمد اعلیٰ تھانوی کے افکار کا جائزہ لیا جارہا ہے۔ یہ جائزہ ان کے رسالہ احکام الآراضی کے ایک تجزیاتی مطالعہ پر مبنی ہے۔[2]

شیخ جلال الدین کے برعکس قاضی محمد اعلیٰ کے حالات زندگی پر تاریخی کتب اور تذکروں میں کوئی مواد نہیں ملتا حتیٰ کہ معاصر ماخذ سے ان کی تاریخ پیدائش و وفات بھی معلوم نہیں ہو سکی ہے۔ محمد اعلیٰ کی ایک دوسری تصنیف "کشاف اصطلاحات الفنون"[3] میں اس کی تکمیل کا سن ۱۱۵۸ھ / ۴۶-۱۷۴۵ء ملتا ہے

---

[1] ملاحظہ کیجیے "برہان" مارچ ۱۹۸۴ء۔

[2] احکام الآراضی کے دو قلمی نسخے مولانا آزاد لائبریری (مسلم یونیورسٹی علیگڈھ) میں یونیورسٹی کلکشن، عربیہ (۲) نمبر ۶۲، اور عبدالسلام کلکشن تاریخ لغوی (۲) ۳۳۱/۱۰۱ کے تحت موجود ہیں۔ انڈیا آفس لائبریری (فہرست عربی مخطوطات، مرتبہ ریو بن لیوی نمبر ۱۷۳) اور اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ (فہرست مخطوطات جلد ۱۶ نمبر ۱۶۹۵، ۳، ۶۲) میں بھی اس کے مخطوطات محفوظ ہیں۔ اس مضمون میں رسالہ کے حوالے علیگڈھ کے اول الذکر نسخہ کے مطابق دیے گئے ہیں۔

[3] یہ مختلف علوم و فنون سے متعلق اصطلاحات کی ایک جامع لغت ہے اس کا ایک مخطوطہ مولانا آزاد

(باقی اگلے صفحہ پر)

درج ہے، اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ۱۸ویں صدی عیسوی کے نصف اول میں باحیات تھے اور تالیفی و تصنیفی کاموں میں مصروف تھے لیکن اس سے ان کے زمانۂ وفات کی بابت کوئی ثبوت نہیں فراہم نہیں ہوتا۔ نورالحسن راشد کاندھلوی نے اپنے ایک مضمون میں "بیاض قلمی مفتی الٰہی بخش کاندھلوی" کے حوالہ سے محمد اعلیٰ تھانوی کا سن وفات ۱۱۹۱ھ (۱۷۷۷-۷۸ء) ذکر کیا ہے[1] لیکن اس کی توثیق کسی اور ذریعہ سے نہیں ہو پائی ہے۔ صاحب نزہۃ الخواطر مولانا سید عبدالحی (۱۸۶۱-۱۹۲۳) نے مولانا اشرف علی تھانوی (۱۸۶۳-۱۹۴۳) کے حوالے سے بصراحت یہ لکھا ہے کہ محمد اعلیٰ تھانوی اورنگ زیب کے عہد میں قصبہ تھانہ کے قاضی تھے اور یہ کہ وفات کے بعد وہ اسی مقام پر مدفون ہوئے۔[2] اگرچہ اس کا ثبوت کسی اور ماخذ سے نہیں ملتا لیکن اُن کے نام کے ساتھ قاضی کے انتساب سے اس عہدہ سے ان کا منسلک ہونا یقینی معلوم ہوتا ہے۔

رسالہ احکام الآراضی مضامین کے اعتبار سے تین ابواب میں منقسم ہے۔ پہلے باب میں دارالحرب و دارالاسلام کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے دوسرے میں بیت المال اور اس کے ذرائع آمدنی سے متعلق امور زیر بحث آئے ہیں اور آخری باب میں فقہ اسلامی کی روشنی میں آراضی ہند کی نوعیت واضح کی گئی ہے۔ اس باب (جس کے مباحث پر یہ مضمون مبنی ہے) کا بیشتر حصہ فارسی میں ہے جب کہ پہلے

(حاشیہ بقیہ صفحہ ۳۳۹) لائبریری (یونیورسٹی کلکشن، علوم عربیہ $\frac{9}{1}$) میں دستیاب ہے، اس کی اشاعت سب سے پہلے کلکتہ سے ۱۸۶۲ء میں ہوئی تھی بعد میں قاہرہ اور تہران سے اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ بطرس بستانی (دائرۃ المعارف، بیروت، ۱۸۸۲ء، الجزء السادس ص ۲۴۶) نے اس لغت کے مؤلف کا نام "محمد علی" ذکر کیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

[1] دیکھیے نورالحسن راشد کاندھلوی "آراضی ہند کی شرعی حیثیت (چند قدیم تحریریں)" مطبوعہ معارف (اعظم گڈھ) جلد ۱۱۵، شمارہ نمبر ۴ (اپریل ۱۹۷۵ء) ص ۲۴۳ (ذیلی تشریحات)

[2] نزہۃ الخواطر، حیدرآباد، ۱۹۵۴ء، الجزء السادس، ص ۲۵۸

٭ ٭

دونوں باب خالصتہً عربی میں ہیں۔ غالباً یہ حصہ تحریر کرتے وقت مصنف کے پیش نظر اس وقت کے ہندوستان میں فارسی زبان کی سرکاری حیثیت اور علمی حلقوں میں اس کی مقبولیت رہی ہو گی۔ جہاں تک محمد اعلیٰ کے ماخذ کا تعلق ہے انھوں نے متعدد قدیم فقہی تالیفات مثلاً فتاویٰ قاضی خاں، ہدایہ، فتح القدیر، تبیین الحقائق وغیرہ استعمال کرنے کے علاوہ مغل کے فقہ کے مجموعوں میں خاص طور سے خزانۃ الروایات[۵۱] اور فتاویٰ عالمگیری سے اقتباسات پیش کیے ہیں۔ مزید براں انھوں نے شیخ جلال الدین کے رسالہ در بیع آراضی سے کافی استفادہ کیا ہے اگرچہ شیخ جلال کے خیالات سے وہ پوری طرح متفق نہیں ہیں جیسا کہ آنے والی تفصیلات سے واضح ہو گا، محمد اعلیٰ کے ماخذ کے ضمن میں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ مصنف نے اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں اس دور میں رائج زرعی نظام سے بھی بہت سی مثالیں پیش کی ہیں ان سے عہد مغلیہ میں آراضی پر حکومت، زمیندار و کسان کے حقوق اور شعبۂ محاصل کے بعض اہم پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ اس لیے فقہی و تاریخی دونوں اعتبار سے رسالہ احکام الآراضی کا آخری باب خاص اہمیت کا حامل ہے۔

آراضی ہند کی نوعیت پر محمد اعلیٰ کی مفصل بحث کا مرکزی خیال یہ ہے کہ فقہی نقطۂ نظر سے اسے نہ تو عشری یا خراجی کی اصطلاح سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور نہ زمیندار یا کسان کو اس کا مالک قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ بیت المال کی املاک کا ایک حصہ ہے اور اس کے لیے فیئی[۵۲] بیت المال کی اصطلاح استعمال کرنا سب سے زیادہ موزوں ہو گا۔

---

۵۱ خزانۃ الروایات ۱۶ ویں صدی عیسوی کے ایک گجراتی عالم قاضی جکن الحنفی (متوفی ۱۵۵۵ء) کی تالیف ہے اس کا ایک قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری (یونیورسٹی کلکشن، عربیہ مذہب (۲) نمبر ۶۶) میں محفوظ ہے۔

۵۲ فیئی کی اصطلاح بنیادی طور پر ان اموال کے لیے مخصوص ہے جو دشمن سے بغیر جنگ یا فوج کشی کے حاصل ہو لیکن یہ اپنے وسیع مفہوم میں ان تمام اموال (منقولہ و غیر منقولہ) کے لیے مستعمل ہے جو دشمن

(باقی صفحہ ۔۔)

محمد اعلیٰ نے آراضی ہند کے لیے فیئی بیت المال کے تصور کو پیش کرتے ہوئے سب سے پہلے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان کی زمین عشری نہیں ہے اس ضمن میں وہ شیخ جلال کی اس دلیل سے اتفاق ظاہر کرتے ہیں کہ گرچہ یہ محقق ہے کہ ہندوستان بزور یا بغلبہ فتح ہوا لیکن اس کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں اور نہ روایۃً یہ منقول ہے کہ یہاں کی مفتوحہ آراضی غانمین میں تقسیم کی گئی۔ ممکن ہے اس کی کچھ مثالیں مل جائیں لیکن ان کی حیثیت شاذ و نادر کی ہوگی جس کی بنیاد پر کوئی عام رائے نہیں ظاہر کی جا سکتی[1] محمد اعلیٰ آراضی ہند کی عدم عشریت کے ثبوت میں بعض واقعاتی شواہد بھی پیش کرتے ہیں، مثال کے طور پر وہ اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہیں کہ ہندوستان کی بیشتر آراضی غیر مسلین کے قبضہ میں ہے۔ مسلمان نہ تو انھیں بے دخل کرتے ہیں اور نہ ان آراضی کی ملکیت

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) سے خواہ جنگ کے نتیجہ میں یا مصالحت ومعاہدہ کے ماحول میں۔ محمد اعلیٰ نے یہاں اسی مملوکۂ بیت المال مراد لیا ہے اور اس کا اطلاق مفتوحہ علاقوں کی زمینوں پر کیا ہے جو غانمین میں تقسیم کیے جانے یا سابق مالکین کے حق میں بحال کیے جانے کے بجائے مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کے لیے وقف قرار دی جائیں۔ اسلام کے زرعی قانون کی رو سے ان زمینوں کا اصل مالک بیت المال ہوتا ہے اور امام یا سلطان کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ان کی کاشت کا اہتمام کرائے۔ وہ اس کا مختار ہے کہ اپنی صوابدید کے مطابق موجودہ قابضین کے ذریعہ یا دوسروں کی وساطت سے ان کی آبادکاری کرائے اور مزارعت و اجارت وغیرہ میں سے جس طریقہ کو چاہے ترجیح دے۔ اس موضوع پر فقہاء کی تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے ابوعبید القاسم بن سلام، کتاب الاموال، القاہرہ، ۱۳۵۳ھ، صفحہ ۹۳ - ابو یوسف کتاب الخراج، صفحہ ۸۹ - ۹۰، ۱۰۶، یحییٰ بن آدم، کتاب الخراج، قاہرہ، ۱۳۴۶ھ، ماوردی الاحکام السلطانیہ، صفحہ ۷۰ - ۷۱۔ بیت المال کی مملوکہ آراضی کی آبادکاری کے مسائل پر محققانہ بحث کے لیے ملاحظہ کیجیے، پروفیسر محمد نجات اللہ صدیقی، اسلام کا نظریۂ ملکیت، دہلی، ۱۹۶۸ء صفحہ ۳۶۶ - ۱، ۳۰۱۔

[1] احکام الآراضی، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری، یونیورسٹی کلکشن، عربیہ (۲) نمبر ۶۲ ورق ۵۲ الف۔

کا دعویٰ کرتے ہیں، مزیدبراں حکومت ان کی پیداوار پر جو محصول عاید کرتی ہے وہ کسی بھی صورت میں اس کا دسواں حصہ (عشر) نہیں ہوتا جو شریعت میں عشری زمین کے لیے مقرر ہے بلکہ اس سے کہیں زاید ہوتا ہے۔ محمد اعلیٰ کے خیال میں ان حقائق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ زمینیں عشری نہیں ہیں اور نہ مسلم حکمراں اس حیثیت سے اُن کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں[1]۔ محمد اعلیٰ نے یہاں ان آراضی کی نوعیت پر خاموشی اختیار کی ہے جو بادشاہ کی جانب سے علماء یا دیگر مسلم مستحقین کو عطا ہوتی تھیں شیخ جلال نے جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے اس طرح کی آراضی کو عشری اور معطیٰ بہ کی مِلک قرار دیا ہے[2]۔

آراضی ہند کے خراجی نہ ہونے پر بحث کرتے ہوئے بھی محمد اعلیٰ شیخ جلال کے طرز استدلال کے مطابق پہلے یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ نہ تو روایت کے طور پر یہ خبر منقول ہے اور نہ گزشتہ بادشاہوں کے سرکاری دستاویزات میں اس کا ذکر ملتا ہے کہ مسلم فاتحین اور حکمرانوں نے مفتوحہ آراضی پر سابق مالکین کی ملکیت برقرار رکھی اور انھیں خراجی کی حیثیت عطا کی[3][4]۔ محمد اعلیٰ اس بحث میں شیخ جلال کے ان تمام دلائل سے متفق نظر آتے ہیں جو مفتوح لوگوں کو زمین کی واپسی اور ان کی ملکیت کی بحالی کی تردید میں انھوں نے پیش کیے ہیں اس کے علاوہ مسلمانوں کی آمد سے قبل قدیم ہندوستان میں زمین کی ملکیت کی بابت جو تصور رائج تھا محمد اعلیٰ اس سے بھی زمینوں کے خراجی اور سابق مالکین کی ملک ہونے کے خلاف ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہاں کی آراضی اسی صورت میں خراجی ہو سکتی ہے جب کہ

---

[1] احکام الآراضی، ۵۲ ب

[2] رسالہ در بیع آراضی، محولہ بالا، ۲ب، ۱۰ب۔

[3] احکام الآراضی، ۵۲ ب

[4] احکام الآراضی، ۵۲ ب-۵۳ الف، رسالہ در بیع آراضی، ۲ الف-۲ ب

[5] احکام الآراضی، ۵۳ ب-۵۴ الف۔ محمد اعلیٰ نے اس خیال کو محض روایت سے منسوب کیا ہے اس کے لیے کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا ہے۔

فتح کے بعد زمینیں ان لوگوں کے حق میں بحال کی گئی ہوتیں جو فتح سے قبل حقیقۃً ان کے مالک تھے۔ مصنف کے اپنے بیان کے مطابق قدیم ہندوستان میں صورت حال یہ تھی کہ راجہ اور ان کی اولاد کو جو راجپوت کہے جاتے تھے تمام زمینوں کا مالک تصور کیا جاتا تھا اور اس تصور کے عام ہونے کی وجہ یہ تھی کہ یہ حکمراں طبقہ کے لوگ تھے، سیاسی قوت وطاقت کے مالک ہونے کے علاوہ انھیں سماجی ومذہبی برتری بھی حاصل تھی، حتیٰ کہ بعض راجہ کو خدا کے اوتار کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ مزید براں کسانوں پر ٹیکس عاید کرنے کا اختیار بھی انھیں کو حاصل تھا۔ محمد اعلیٰ کی رائے میں راجہ یا اس کے اہل خاندان سے زمین کی ملکیت منسوب کرنا مبنی برحقیقت نہ تھا اور اگر اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے تب بھی انھیں جملہ آراضی کا مالک نہیں کہا جا سکتا اس لیے کہ ہر ملک میں خواہ دارالحرب ہو یا دارالاسلام کچھ آراضی غیر مملوکہ ہوتی ہیں مثلاً وہ زمینیں جو آبادی سے ملحق چراگاہ وغیرہ کے کام آتی ہیں یا جو آبادی سے دور افتادہ وبنجر ہوتی ہیں اور موات کہلاتی ہیں۔ اس طرح کی آراضی (غیر مملوکہ ومباح) کسی بھی صورت میں حکمراں کی ملک نہیں ہو سکتیں۔[1] ان حقائق کی روشنی میں محمد اعلیٰ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ فتح سے پہلے کے زمانہ میں جن لوگوں کو زمین کا مالک تصور کیا جاتا تھا وہ اصلاً ان کے مالک نہ تھے تو پھر فتح کے بعد ان کی ملکیت کی توثیق کرنے اور زمین کو خراجی قرار دینے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔[2] اولین فتوحات کے زمانہ سے قطع نظر محمد اعلیٰ بعد میں کسی سلطان کے عہد میں بھی اسے خارج از امکان قرار دیتے ہیں کہ سابق حکمراں طبقہ کے لوگوں کو خراج کے عوض زمین کی ملکیت عطا کی گئی ہوگی اس لیے کہ یہ مصلحت کے مطابق نہ ہوتا۔ غیر مسلم رؤسا کو زمین کا مالک بنانا ان کی قوت وطاقت میں اضافہ کا سبب اور انھیں جنگ وجدال کے عناصر پیدا کرنے کا موجب ہوتا جو مسلم سلطنت کے ثبات واستحکام کے لیے

---

[1] احکام الآراضی، ۵۴ الف۔ ۵۴ ب

[2] احکام الآراضی، ۵۵ ب۔ ۵۶ الف

خطرہ بھی بن سکتا تھا، محمد اعلیٰ کی رائے میں قرین قیاس یہی ہے کہ سلاطین یا بادشاہوں نے مصلحت کے خلاف یہ اقدام نہ کیا گیا ہوگا۔[1] بلکہ خود ان کے عمل سے مذکورہ صورت کا عدم وقوع ثابت ہوتا ہے۔ مصنف یہاں اس نکتہ پر خاص زور دیتے ہیں کہ اگر اولین فتوحات کے بعد یا بعد کے زمانہ میں شاہی خاندان یا حکمراں طبقہ کے لوگوں کو سابق مالکین آراضی تسلیم کر کے ان کے ساتھ معاملہ کیا گیا ہوتا اور زمین کو خراجی حیثیت دی گئی ہوتی تو سلاطین و ملوک یقیناً اسی کے مطابق عمل کرتے لیکن صورت حال اس کے برعکس نظر آتی ہے۔ معاصر بادشاہ کے طرز عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد اعلیٰ لکھتے ہیں کہ وہ سابق رؤسار کو جنھیں اب زمیندار کہا جاتا ہے مالک زمین تسلیم نہیں کرتے۔ وہ انھیں محض حکومت کی انتظامی مشنری کا ایک جزء سمجھتے ہیں اور کسانوں سے ٹیکس کی تحصیل اور زراعت کی تعمیر و ترقی کے لیے ان کی اعانت طلب کرتے ہیں۔[2] اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کہ اُن کے دور میں زمینداری محض ایک سرکاری خدمت تھی محمد اعلیٰ یہ ذکر کرتے ہیں کہ اس خدمت سے تعلق یا علیحدگی بادشاہ کی مرضی پر موقوف ہوتی ہے۔ مزید براں وہ اس کے موروثی ہونے کے تصور کو جیسا کہ عام طور سے مشہور ہے جہل و نادانی پر محمول کرتے ہیں۔[3] ان کی رائے میں حکومت کی جانب سے زمیندار کو مالک نہ تسلیم

---

۱ احکام الآراضی، ۵۶ الف۔

۲ احکام الآراضی، ۵۴ ب۔ ۵۵ الف، ۵۶ الف

۳ احکام الآراضی، ۵۵ الف، مصنف نے زمینداری کے موروثی ہونے کے تصور کو غلط قرار دیا ہے۔ اس رائے کے برخلاف مغل دور کی تاریخی کتابوں اور فرامین و ریکارڈ کے مجموعوں میں زمینداری کی بابت بہت سے ایسے حوالے ملتے ہیں جن سے ان کا موروثی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے وقائع اجمیر (نقل از مخطوطہ آصفیہ لائبریری، حیدرآباد) ریسرچ لائبریری، شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی نقلی نمبر ۶، ص ۲۴۵-۲۴۶، دارالعلوم، اوٹوگراف (مخطوطہ بوڈلین لائبریری) شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی نمبر ۱۸۵، ۴۳ الف ۴۴ الف ۵۲ ب-۵۳ الف۔ زمینداری سے متعلق مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے: پروفیسر عرفان حبیب: اگریرین سسٹم آف مغل انڈیا (اردو ترجمہ جمال محمد صدیقی بعنوان مغلوں کا طریق زراعت) نیویارک ۱۹۶۳ء ص ۱۴۵-۱۵۵۔

فتح کے بعد زمینیں ان لوگوں کے حق میں بحال کی گئی ہوتیں جو فتح سے قبل حقیقۃً ان کے مالک تھے۔ مصنف کے اپنے بیان کے مطابق قدیم ہندوستان میں صورت حال یہ تھی کہ راجا اور ان کی اولاد کو جو راجپوت کہے جاتے تھے تمام زمینوں کا مالک تصور کیا جاتا تھا اور اس تصور کے عام ہونے کی وجہ یہ تھی کہ یہ حکمراں طبقہ کے لوگ تھے، سیاسی قوت وطاقت کے مالک ہونے کے علاوہ انھیں سماجی و مذہبی برتری بھی حاصل تھی، حتیٰ کہ بعض راجہ کو خدا کے اوتار کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ مزید براں کسانوں پر ٹیکس عاید کرنے کا اختیار بھی انھیں کو حاصل تھا۔ محمد اعلیٰ کی رائے میں راجہ یا اس کے اہل خاندان سے زمین کی ملکیت منسوب کرنا مبنی برحقیقت نہ تھا اور اگر اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے تب بھی انھیں جملہ آراضی کا مالک نہیں کہا جا سکتا اس لیے کہ ہر ملک میں خواہ دار الحرب ہو یا دار الاسلام کچھ آراضی غیر مملوکہ ہوتی ہیں مثلاً وہ زمینیں جو آبادی سے ملحق چراگاہ وغیرہ کے کام آتی ہیں یا جو آبادی سے دور افتادہ و بنجر ہوتی ہیں اور موات کہلاتی ہیں۔ اس طرح کی آراضی (غیر مملوکہ ومباحہ) کسی بھی صورت میں حکمراں کی ملک نہیں ہو سکتیں۔[۱] ان حقائق کی روشنی میں محمد اعلیٰ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ فتح سے پہلے کے زمانہ میں جن لوگوں کو زمین کا مالک تصور کیا جاتا تھا وہ اصلاً ان کے مالک نہ تھے تو پھر فتح کے بعد ان کی ملکیت کی توثیق کرنے اور زمین کو خراجی قرار دینے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔[۲] اولین فتوحات کے زمانہ سے قطع نظر محمد اعلیٰ بعد میں کسی سلطان کے عہد میں بھی اسے خارج از امکان قرار دیتے ہیں کہ سابق حکمراں طبقہ کے لوگوں کو خراج کے عوض زمین کی ملکیت عطا کی گئی ہو گی اس لیے کہ یہ مصلحت کے مطابق نہ ہوتا۔ غیر مسلم رؤسا کو زمین کا مالک بنانا ان کی قوت وطاقت میں اضافہ کا سبب اور انھیں جنگ وجدال کے عناصر پیدا کرنے کا موجب ہوتا جو مسلم سلطنت کے ثبات واستحکام کے لیے

---

[۱] احکام الآراضی، ۵۴ الف۔ ۵۴ ب

[۲] احکام الآراضی، ۵۵ ب۔ ۵۶ الف

خطرہ بھی بن سکتا تھا، محمد اعلیٰ کی رائے میں قرین قیاس یہی ہے کہ سلاطین یا بادشاہوں نے مصلحت کے خلاف یہ اقدام نہ کیا گیا ہوگا۔[۱] بلکہ خود ان کے عمل سے مذکورہ صورت کا عدم وقوع ثابت ہوتا ہے۔ مصنف، یہاں اس نکتہ پر خاص زور دیتے ہیں کہ اگر اولین فتوحات کے بعد یا بعد کے زمانہ میں شاہی خاندان یا حکمراں طبقہ کے لوگوں کو سابق مالکین اراضی تسلیم کرکے ان کے ساتھ معاملہ کیا گیا ہوتا اور زمین کو خراجی حیثیت دی گئی ہوتی تو سلاطین و ملوک یقیناً اسی کے مطابق عمل کرتے لیکن صورت حال اس کے برعکس نظر آتی ہے۔ معاصر بادشاہ کے طرز عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد اعلیٰ لکھتے ہیں کہ وہ سابق رؤسا، کو جنھیں اب زمیندار کہا جاتا ہے مالک زمین تسلیم نہیں کرتے۔ وہ انھیں محض حکومت کی انتظامی مشنری کا ایک جزء سمجھتے ہیں اور کسانوں سے ٹیکس کی تحصیل اور زراعت کی تعمیر و ترقی کے لیے ان کی اعانت طلب کرتے ہیں۔[۲] اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کہ اُن کے دور میں زمینداری محض ایک سرکاری خدمت تھی محمد اعلیٰ یہ ذکر کرتے ہیں کہ اس خدمت سے تعلق یا علیحدگی بادشاہ کی مرضی پر موقوف ہوتی ہے۔ مزید براں وہ اس کے موروثی ہونے کے تصور کو جیسا کہ عام طور سے مشتہر ہے جہل و نادانی پر محمول کرتے ہیں۔[۳] ان کی رائے میں حکومت کی جانب سے زمیندار کو مالک نہ تسلیم

---

۱ احکام الاراضی، ۵۶ الف۔

۲ احکام الاراضی، ۵۴ ب۔ ۵۵ الف، ۵۶ الف۔

۳ احکام الاراضی، ۵۵ الف، مصنف نے زمینداری کے موروثی ہونے کے تصور کو غلط قرار دیا ہے۔ اس رائے کے برخلاف مغل دور کی تاریخی کتابوں اور فرامین و ریکارڈ کے مجموعوں میں زمینداری کی بابت بہت سے ایسے حوالے ملتے ہیں جن سے ان کا موروثی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے وقائع اجمیر (نقل از مخطوطہ آصفیہ لائبریری، حیدرآباد) ریسرچ لائبریری، شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی نقلی نمبر ۹، ص ۲۴۵-۲۴۶، دارالعلوم، اوٹو گراف (مخطوطہ بوڈلین لائبریری) شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی نمبر ۱۸۵، ۴۳ الف ۴۴ الف ۵۲ ب-۵۳ الف۔ زمینداری سے متعلق مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے پروفیسر عرفان حبیب، اگریرین سسٹم آف مغل انڈیا (اردو ترجمہ جمال محمد صدیقی بعنوان مغلوں کا طریق زراعت) نیویارک ۱۹۶۳ء ص ۱۵۴-۱۵۵۔

کرنے کا ایک بین ثبوت یہ ہے کہ زرعی ٹیکس ان کے ذمہ واجب الادا نہیں ہوتا ہے بلکہ کسانوں سے وصول کیا جاتا ہے[1] اور اگر کسی علاقہ میں کسان محصول کی ادائیگی سے قبل اپنی زمین چھوڑ کر کہیں فرار ہو جاتے ہیں تو وہاں کے زمیندار سے اس کا مطالبہ نہیں کیا جاتا۔[2]

ان تمام تفصیلات سے محمد اعلیٰ کا مقصود یہ ذہن نشین کرانا ہے کہ قدیم ہندوستان میں حکمراں طبقہ اصلاً زمین کا مالک نہ تھا اس لیے فتح کے بعد ان کی ملکیت بحال کرنے اور ان کی آراضی کو خراجی تسلیم کرنے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر وہ یہ بھی ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ موجودہ زمینداروں (جو درحقیقت سابق رؤساہی کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں) کا دعویٰ ملکیت قانوناً ناقابل تسلیم ہے۔[3]

رؤسا و زمینداران کے علاوہ آراضی سے متعلق دوسرا طبقہ کسانوں کا تھا۔ محمد اعلیٰ انھیں بھی حقیقی مالک تسلیم نہیں کرتے۔ اس کے لیے بھی وہ قدیم ہندوستان کے حالات کی روشنی میں ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس دور میں کسان بھی زمین کے اصل مالک نہ تھے اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو محض کاشتکار سمجھتے تھے اور مقبوضہ زمین کی ملکیت کے دعوے دار نہ تھے۔ اس لیے فتح کے بعد ان کے ساتھ مالک زمین کی حیثیت سے برتاؤ کرنا اور ان کی آراضی کو خراجی زمین کے ضوابط کے تحت لانا کیسے صحیح ہو سکتا تھا۔[4] محمد اعلیٰ اپنے نقطہ نظر کی حمایت میں واقعاتی شواہد پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کسانوں کی مذکورہ حیثیت کی برقراری اس سے بھی واضح ہے کہ اس دور میں کسان زمین کی ملکیت کا دعویٰ نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ اگر ان میں سے کسی کو بے دخل کر کے اس کی زمین دوسرے کو برائے کاشت دی جاتی ہے تو وہ اس پر کوئی نکیر نہیں ظاہر کرتا۔[5] مزید براں محمد اعلیٰ زمینوں میں

---

[1] احکام الآراضی، ۵۶ الف ۔ ۵۶ ب

[2] احکام الآراضی، ۵۶ ب۔

[3] احکام الآراضی، ۵۵ ب ۔ ۵۶ الف [4] احکام الآراضی، ۵۵ الف، ۵۶ ب

[5] احکام الآراضی، ۵۵ الف ۔ ۵۵ ب، ۶۱ الف ۔ ۶۱ ب، اس دلیل میں کچھ زیادہ وزن نہیں (باقی صفحہ آئندہ پر ملاحظہ کیجیے)

حکومت کے انتظامی تصرفات اور آبادکاری و کاشت کے بہتر اہتمام کی غرض سے ایک سے بازیابی اور دوسرے کو حوالگی کے اختیار سے بھی یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ کسان مالک زمین تسلیم نہیں کیے جاتے۔ وہ اپنے مشاہدہ کی روشنی میں ذکر کرتے ہیں کہ کاشت میں بے توجہی اور سرکاری مطالبہ کی ادائیگی میں کوتاہی کی صورت میں حکومت ایک کے قبضہ سے زمین نکال کر دوسرے کو برائے کاشت دینا نہ صرف اپنا حق تصور کرتی ہے بلکہ اسے استعمال کرتی رہتی ہے[1] اپنے دور کے کسانوں کی ملکیت آراضی کے خلاف ان تمام دلائل سے محمد اعلیٰ کا مقصود اولین فتوحات کے بعد کسانوں کے حق میں آراضی کی ملکیت کی بحالی اور ان کی خراجی حیثیت کی تردید ہے جیسا کہ اس سے قبل سابق رؤساء (جو بعد میں زمیندار کہلائے) کے حق میں اس طرح کی صورت کے وقوع کو خارج از امکان قرار دے چکے ہیں۔

محمد اعلیٰ آراضی ہند کے خراجی ہونے کے تصور کو اس دور میں رائج زرعی نظام کے بعض دیگر پہلوؤں کی بنیاد پر بھی غلط ثابت کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ لکھتے ہیں کہ معاصر حکومت کے تحت عام طور سے یہ دستور رائج ہے کہ اگر کوئی کسان اپنی زمین زیر کاشت لانے سے عاجز رہتا ہے یا اسے غیر زرعی چھوڑ کر کہیں بھاگ جاتا ہے اور اس کی زمین کسی دوسرے کو کاشت کے لیے دی جاتی ہے تو اس کے محصول سے اصل کسان کے لیے کچھ محفوظ نہیں رکھا جاتا۔ محمد اعلیٰ فتاویٰ عالمگیری کے حوالہ سے اس عمل کو خراجی زمین کے ضابطہ سے متناقض قرار دیتے ہیں[2]۔ اس کے علاوہ اس عہد کا نظم محاصل بھی محمد اعلیٰ کی رائے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) معلوم ہوتا۔ اس لیے کہ کسی کی ملکیت تسلیم کرنے کے بعد بھی حکومت کو اجتماعی مفاد کے تحت یا زمین کی کاشت کے بہتر اہتمام کی غرض سے ملکیت کے انتقال یا تنسیخ کا اختیار حاصل رہتا ہے۔ اس اختیار کے استعمال کی صورت میں کسانوں کی خاموشی ملکیت کے خلاف واضح ثبوت نہیں بن سکتی۔

[1] احکام الآراضی، ۶۰ ب، ۶۱ الف۔ ۶۱ ب۔

[2] احکام الآراضی، ۶۰ الف۔ ۶۰ ب۔ فتاویٰ عالمگیری کی محولہ عبارت کا مضمون یہ ہے کہ اگر اہل خراج میں سے کوئی اپنی زمین چھوڑ کر فرار ہو جائے تو اس کی زمین دوسرے کو کاشت کے لیے دی جائے گی اور حکومت کو نئے کاشتکار سے سمجھوتہ کے مطابق جو کچھ حاصل ہوگا اس میں سے خراج کی مقدار منہا کر کے باقی اصل (باقی حاشیہ پر)

میں آراضی کے خراجی ہونے کے خلاف شہادت دیتا ہے، ان کے اپنے مشاہدہ کے مطابق حکومت کی جانب سے کسانوں سے جو زرعی ٹیکس بشمول دیگر محاصل وصول کیا جاتا ہے ان کی مجموعی مقدار پیداوار کے نصف حصہ سے زاید ہوتی ہے اور یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ شریعت کی رو سے خراجی زمین پر محصول کی انتہائی حد پیداوار کا نصف حصہ ہے، مصنف کے خیال میں اس کی دو توجیہہ ہو سکتی ہے یا تو مسلم حکمرانوں سے اسلام کے قانون محاصل کی خلاف ورزی منسوب کی جائے[1] یا یہ تسلیم کیا جائے کہ وہ ان زمینوں کو خراجی نہیں سمجھتے تھے، محمد اعلیٰ دوسری صورت کو ترجیح دیتے ہیں اس لیے مسلم بادشاہوں کو شریعت کی علانیہ خلاف ورزی کا مرتکب گردانا صحیح نہیں ہے خاص اس صورت میں جب کہ ان کے عمل کی شرعی بنیاد موجود ہے اور وہ یہ کہ وہ ان زمینوں کے ساتھ خراجی کا معاملہ نہیں کرتے ہیں اور نہ ہی ان سے وصول کیے جانے والے محصول کو خراج کی صنف سے شمار کرتے ہیں[2] محمد اعلیٰ غالبًا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کسان کے لیے محفوظ رکھا جائے گا اور اس کی واپسی پر اسے حوالہ کیا جائے گا (فتاویٰ عالمگیری، مطبع مجیدی، کانپور، ۱۳۵۳ھ، المجلد الثانی، ص ۲۴۲)

[1] یہ امر قابل غور ہے کہ خود محمد اعلیٰ نے یہ صراحت کی ہے کہ زمین کی پیداوار سے نصف حصہ سے زائد جو وصول کیا جاتا تھا اس میں زرعی ٹیکس کے علاوہ دیگر محاصل بھی شامل تھے اور اس کا تناسب یہ تھا کہ نصف حصہ بطور زرعی ٹیکس اور بقیہ نصف سے دیگر محاصل لیے جاتے تھے، اس طرح دونوں مل کر نصف سے متجاوز کر جاتے تھے، اس بیان کے مطابق خود زرعی ٹیکس کی شرح نصف پیداوار سے زاید نہ ہوتی تھی اس لیے اگر زمین کو خراجی مان بھی لیا جائے تو مذکورہ صورت میں خراج کی شرح تحصیل میں شریعت کی خلاف ورزی کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔ البتہ حکومت کو اس وجہ سے مورد الزام ٹھہرایا جا سکتا ہے کہ اس کے تساہل کی وجہ سے کسانوں سے زرعی ٹیکس کے علاوہ دیگر محاصل وصول کیے جاتے تھے جس کے نتیجہ میں ان کی پیداوار کا بیشتر حصہ محاصل کی نذر ہو جاتا تھا اور یہ یقیناً شرعی اصول کے منافی تھا۔

[2] احکام الآراضی، ۵۹ الف، ۵۹ ب۔

؞ ؞

کہنا یہ چاہتے ہیں کہ زرعی ٹیکس کی در میں نصف پیداوار کی حد بندی خراج کی صورت میں ہے اگر محصول کو خراج سے نہ تعبیر کیا جائے تو نصف پیداوار سے زاید کی ممانعت اس پر لاگو نہ ہوگی۔

آراضی ہند کو غیر خراجی ثابت کرنے کے لیے آخری دلیل کے طور پر محمد اعلیٰ شیخ جلال کے اس خیال سے اتفاق ظاہر کرتے ہیں کہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ابتدائی فتح کے بعد سابق رؤسا یا رعایا (کاشتکار) کو اصل مالک تصور کر کے حنفی مسلک کے مطابق زمینیں واپس کی گئی ہوں اور ان پر خراج عاید کیا گیا ہو اس بات کا قوی امکان موجود ہے کہ بعد کے سلاطین نے امام شافعی کی رائے پر عمل کرتے ہوئے اجتماعی مفاد میں ان زمینوں کی خراجی حیثیت ختم کر کے انھیں بیت المال کی ملک میں داخل کر دیا ہو۔[1]

محمد اعلیٰ عہد وسطیٰ میں ہندوستان کے زرعی نظام کو اسلام کے زرعی نظام سے تطبیق دیتے ہوئے حکومت کے زمینداروں اور کسانوں سے تعلقات، آراضی پر ان کے حقوق اور آراضی کی شرعی حیثیت کی توضیح اس انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق اولین فتوحات یا مسلم حکومت کے قیام کے بعد نئے علاقوں کی فتح کے وقت جس طرح بدستور سابق رؤسا، کا مقامی اثر و رسوخ قائم رہا اور ان کے ذریعہ کسانوں سے ٹیکس کی تحصیل ہوتی رہی اسی طرح مفتوحین میں جو

---

[1] احکام الآراضی، ۵۹ ب۔ یہ بات پہلے واضح کی جا چکی ہے کہ امام ابوحنیفہ کے برعکس امام شافعی کے نزدیک ان علاقوں کی آراضی جو بزور یا بغلبہ فتح کیے جائیں سابق مالکین کو واپس کرنا جائز نہیں ہے۔ ان کے خیال میں آراضی بھی غانمین کا حق ہیں اور انھیں تقسیم کی جائیں گی الا آنکہ وہ بطیب خاطر اس سے براءت ظاہر کر لیں۔ اس صورت میں وہ زمینیں تمام مسلمانوں پر وقف سمجھی جائیں گی اگر ان کی آبادکاری سابق مالکین کے ذریعہ کرائی جائے تو ان کی حیثیت محض کاشتکار کی ہوگی۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے محمد بن ادریس الشافعی، کتاب الام، مطبع امیریہ، مصر ۱۳۲۱ھ، الجزء الرابع، ص ۱۰۳-۱۰۶
ابویوسف، کتاب الخراج، ص ۱۳-۱۵

کسان یا کاشتکار تھے اُن کی سابق حیثیت بقرار رہی۔ وہ پیداوار میں اضافہ کے لیے کوشاں رہے اور مقررہ محصول کی ادائیگی کرتے رہے جیساکہ اُن سے مطلوب تھا لیکن وہ زمانۂ ماقبل فتح کے مثل مالکانہ حقوق سے عاری ہے[1]

محمد اعلیٰ حکومت و کسانوں کے باہمی معاملہ کو مزارعت[2] کا نام دیتے ہیں اور اس کی تائید میں یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ اس میں شبہ نہیں کہ حکومت و کسانوں کے مابین اس طرح کے معاملہ کے باقاعدہ طے ہونے کا کوئی دستاویزی ثبوت نہیں ملتا لیکن اس کی چنداں حاجت نہیں اس لیے کہ یہ عمل زمانۂ قدیم سے بدستور رائج ہے اور اس کی حیثیت "معروف" کی ہوگئی ہے اور فقہاء نے اس طرح کی صورتوں میں بغیر کسی رسمی سمجھوتہ کے مزارعت کا معاملہ جائز قرار دیا ہے جیساکہ فتاویٰ عالمگیری سے واضح ہوتا ہے۔[3]

---

[1] احکام الآراضی، ۵۴ ب-۵۵ الف، ۵۷ الف

[2] مزارعت صاحب زمین اور کاشتکار کے مابین ایک قسم کے معاہدہ کا نام ہے جس کی رو سے اول الذکر دوسرے کو زمین کی کاشت کی اجازت دیتا ہے اور دونوں ایک متعین تناسب کے تحت اس کی پیداوار میں شریک ہوتے ہیں۔ فقہاء کے نزدیک اس کی بعض شکلیں جائز ہیں اور بعض ناجائز۔ اصولی طور پر وہ شکلیں ناجائز ہیں جن میں کسی ایک شریک کے خسارے کا امکان ہو یا باہمی نزاع کا اندیشہ ہو۔ تفصیل کے لیے دیکھئے علاء الدین ابوبکر کاسانی، بدائع الصنائع، مطبع جمالیہ، مصر ۱۹۱۰ء، الجزء السادس، ص ۱۷۵-۱۸۵، فتاویٰ عالمگیری، المجلد الرابع، ص ۶۴-۶۵ اور مولانا محمد تقی امینی، اسلام کا زرعی نظام، دہلی ۱۹۵۵ء، ص ۱۸۰-۱۹۸۔

[3] احکام الآراضی، ۵۷ ب-۵۸ الف، فتاویٰ عالمگیری کے متعلقہ مبحث کے مطابق اگر کوئی زمین مزارعت کے لیے دینے کے قابل ہے اور وہ ایسے موضع میں واقع ہے جہاں عام طور پر اس طرح کا معاملہ کیا جاتا ہے اور بعض دفعہ صاحب زمین کی مرضی حاصل کرنا ضروری نہیں سمجھا جاتا، مزید براں مزارعت کے تحت کاشتکار کو پیداوار میں جو حصہ ملتا ہے وہ بھی معروف ہے۔ ایسے مواضع میں اگر کوئی مزارعت کے طور پر زمین کی کاشت صاحب زمین سے باقاعدہ سمجھوتہ و اجازت کے بغیر کرے تو یہ عمل جائز ہوگا۔ (فتاویٰ عالمگیری، المجلد الرابع، ص ۲۳۵)

جہاں تک کسانوں سے وصول کیے جانے والے محصول کا تعلق ہے محمد اعلیٰ اسے خراج کے بجائے اُجرت وکرایہ یا (مزارعت کے تحت) صاحب زمین کے حصہ سے تعبیر کرتے ہیں نفس آراضی کی بابت ان کی بحث کا ماحصل یہ ہے کہ اس پر نہ تو عشری کی اصطلاح صادق آتی ہے اور نہ خراجی کی[۵۱] اور فقہی نقطہ نظر سے آراضی ہند کی وہی نوعیت ہے جو احناف کے علاوہ دیگر فقہار (شافعی، مالکی وحنبلی) کے نزدیک سواد عراق کی ہے اور حنفی فقہار کے مطابق سرزمین مصر کی ہے[۵۲] اس لحاظ سے اس پر فیئی بیت المال

[۵۱] یہ خیال اورنگ زیب کے اس مشہور فرمان سے متناقض معلوم ہوتا ہے جو نظم محاصل سے متعلق ۱۶۶۹ء میں جاری کیا گیا تھا اس میں عشری وخراجی دونوں نوع کی زمینوں کا تذکرہ ہے اور آراضی کی اس تقسیم کے اعتبار سے محصول کے قواعد وضوابط بیان کیے گئے ہیں اس فرمان کے لیے دیکھیے علی محمد خاں مرأۃ احمدی، بمبئی، ۱۸۸۹ء حصہ اول، ص ۲۸۳-۲۸۸، اور فتاویٰ عالمگیری کے باب عشر وخراج کی روشنی میں اس فرمان کے تجزیہ کے لیے دیکھیے، خاکسار کا مضمون "فرمان آف اورنگ زیب آف ٹیکسیشن"، مطبوعہ اسلامک کلچر، حیدرآباد، جلد ۵۲، شمارہ نمبر ۳، اپریل ۱۹۷۸ء، ص ۱۱۱-۱۲۶

[۵۲] احناف کی رو سے عراق کی فتح فوج کشی کے بعد حاصل ہوئی تھی اور مفتوحہ آراضی حضرت عمرؓ کے حکم سے غانمین میں تقسیم کرنے کے بجائے وہاں کے اصل باشندوں کے قبضہ میں چھوڑ دی گئی تھیں، احناف کے خیال میں یہ زمینیں خراجی تھیں اور ان کے قابضین کو مالکانہ حقوق حاصل تھے، اس کے برخلاف امام شافعی ودیگر فقہار کے نزدیک آراضی عراق کی حیثیت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان علاقوں کی فتح کے بعد فوجیوں کو مفتوحہ آراضی کے حق سے دستبردار ہونے پر راضی کر لیا تھا اور اسے اجتماعی مفاد کے تحت تمام مسلمانوں کا وقف قرار دیا تھا، اصل باشندوں کے پاس انھیں رہنے دیا گیا تھا لیکن ان کی حیثیت محض کاشتکار کی تھی۔ بیع ورہن اور ملکیت کے دیگر حقوق انھیں حاصل نہ تھے، بعینہٖ یہی نقطۂ نظر حنفی فقہار نے مصر کی آراضی کے سلسلہ میں پیش کیا ہے۔ یعنی انھیں غانمین میں تقسیم کرنے کے بجائے تمام مسلمانوں کی ملک قرار دیا گیا تھا۔ ملاحظہ کیجیے محمد بن ادریس الشافعی، کتاب الام، محولہ بالا، ص ۶۸، ۱۰۳، الماوردی، الاحکام السلطانیہ، ص ۱۵۵-۱۵۷، ابویوسف، کتاب الخراج، ص ۱۲-۱۶، ۳۵-۳۶- شاہ ولی اللہ دہلوی، ازالۃ الخفاء، ص ۱۳۹۔

کی اصطلاح منطبق کرنا زیادہ صحیح ہوگا۔[۱] فقہ کی رُو سے آراضی ہند کی یہ نوعیت متعین کرتے ہوئے محمد اعلیٰ آخر میں زمیندار و کسان دونوں کے لیے اس کی ملکیت کے دعویٰ کو باطل قرار دیتے ہیں اور اس کے خرید و فروخت کو ناجائز تصور کرتے ہیں۔[۲]

آراضی ہند کی شرعی حیثیت پر محمد اعلیٰ اور شیخ جلال کے خیالات میں نتائج کے لحاظ سے ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ محمد اعلیٰ آراضی ہند کی عدم عشریت و خراجیت کو ثابت کر کے اور اسے فیئ بیت المال قرار دے کر اپنی بحث کو موقوف کر دیتے ہیں۔ جب کہ شیخ جلال اس سے آگے بڑھ کر اس نکتہ پر بھی زور دیتے ہیں کہ اگر سلطان یا بادشاہ ان آراضی کا کوئی حصہ کسی مستحق مسلمان کو عطا کرے اور معطیٰ لہ اس کی کاشت کا اہتمام کرے تو وہ قطعہ زمین عشری شمار ہوگا اور اس کی ملک قرار پائے گا۔[۳] شیخ جلال کی جانب سے اس وضاحت کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنے رسالہ کے ذریعہ ان معاصر علماء کے خیالات کی تردید کرنا چاہتے تھے جن کے نزدیک آراضی مدد معاش کے مستحقین مالکانہ حقوق سے محروم تھے اور زمین کی فروخت یا کسی اور ذریعہ سے انتقال ملکیت کے مجاز نہ تھے۔ قاضی محمد اعلیٰ کا اس مسئلہ میں کیا موقف تھا اس کی وضاحت نہیں ملتی۔ گرچہ مفتی الٰہی بخش (متوفی ۱۲۴۵ھ/۱۸۲۹ء) کی قلمی بیاض سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ محمد اعلیٰ تھانوی نے آراضی مدد معاش کے شرعی حکم پر کوئی فتویٰ تحریر کیا تھا اور اسے مفتی صاحب نے قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے پاس اظہار خیال کے لیے ارسال کیا تھا لیکن اس فتویٰ کے مضمون کے بارے میں کوئی

---

[۱] اسلام کے زرعی نظام کی اصطلاح میں وہ زمینیں جو لاوارث ہو کر بیت المال کی ملک میں داخل ہو جاتی ہیں یا بغلبہ مفتوح ہونے کے بعد مسلمانوں پر وقف قرار دی جاتی ہیں اور مقررہ اُجرت پر کاشت کے لیے دوسروں کے حوالہ کی جاتی ہیں ارض المملکۃ یا ارض الحوز کہلاتی ہیں۔ دیکھیے ابن عابدین الشامی، رد المختار مصر، ۱۲۷۲ھ، الجزء الثالث، ص۳۵۳، کتاب الخراج ص۵۲۔

[۲] احکام الآراضی، ۶۱ ب - ۶۲ الف

[۳] رسالہ در بیع آراضی، ۲ ب، ۸ ب، ۱۰ ب

اطلاع فراہم نہ ہو سکی [۵۱]

آراضی ہند کی شرعی حیثیت پر محمد اعلیٰ نے اپنی رائے بظاہر عمومی انداز میں پیش کی ہے لیکن ان کے طرزِ بیان اور ایک مخصوص طبقہ کے لوگوں کی ملکیت رد کرنے پر خاص زور سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ان کے پیش نظر خاص طور سے وہ زمینیں تھیں جو غیر مسلمین کی مقبوضہ تھیں لیکن ان کی ملکیت کے لیے کوئی قانونی بنیاد یا قرائنی ثبوت موجود نہ تھا۔ محمد اعلیٰ ان زمینوں پر بادشاہ یا حکومت کے حق تصرف کو تسلیم کرتے ہیں اور اس بات کے بھی قایل نظر آتے ہیں۔ بادشاہ کو اپنی صوابدید کے مطابق اجتماعی مفاد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کی کاشت و آبادکاری کے اہتمام کا اختیار حاصل ہے، لیکن وہ کسی کو اس آراضی کا بعض حصہ بطور ملکیت دے سکتا ہے کہ نہیں محمد اعلیٰ کی تفصیلات سے اس فروعی مسئلہ پر کوئی روشنی نہیں، اگر مصنف کے نتائج بحث کو عمومی انداز میں قبول کیا جائے یا بالفاظ دیگر اسے جملہ آراضی ہند پر منطبق کیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس وقت ہندوستان میں مسلمان کسی جگہ عملاً زمین پر قابض نہ تھے اور نہ ہی ان میں کوئی کاشتکار تھا لیکن اس بات کا تاریخی حقائق کی کسوٹی پر پورا اترنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے ان کے نقطۂ نظر کو جملہ آراضی پر چسپاں کرنا موزوں نہ ہوگا، واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی آراضی مختلف النوع ہیں اور ان تمام کی شرعی حیثیت کی بابت مجموعی طور پر کوئی ایک رائے نہیں قائم کی جا سکتی۔ ہر نوع کی وضاحت کے ساتھ شریعت کی روشنی میں اس کی قانونی حیثیت متعین کرنا زیر بحث مسئلہ پر اظہار خیال کا معقول و معتدل طریقہ ہوگا۔ قاضی محمد اعلیٰ کے پیشرو شیخ جلال الدین تھانیسری نے بھی اپنے رسالہ میں ایک جگہ اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے اگرچہ ان کی بحث مدد معاش کی آراضی پر مرکوز ہے۔ یہاں خاتمہ بحث کے طور پر

---

۵۱ مذکورہ مباحث میں محمد اعلیٰ تھانوی کے فتویٰ کے حوالے اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے اس پر اظہار خیال کے لیے دیکھیے نورالحسن راشد کاندھلوی کا مضمون "آراضی ہند کی شرعی حیثیت" مطبوعہ معارف، محولہ بالا، ص ۲۷۶-۲۹۱

ان کے رسالہ سے متعلقہ پیراگراف کا خلاصہ پیش کرنا افادیت و دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

شیخ جلال نے قبضہ و ملکیت کی نوعیت میں اختلاف کے اعتبار سے آراضی ہند کی آٹھ قسموں کی وضاحت کی ہے اور ہر ایک کا حکم جداگانہ بیان کیا ہے۔

(۱) پہلی وہ جس کے قابض اول یا اصل کاشتکار (حارث) اس حالت میں انتقال کر گئے کہ ان کا کوئی وارث نہ تھا یا وہ اپنے آبائی موضع کو چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہو گئے پھر اس پر دوسرا شخص (غیر قانونی طور پر) قابض ہو گیا اور یہ قابض ثانی بھی کچھ عرصہ بعد مر گیا اور وہ زمین اس کے ورثہ یا خاندان والوں میں منتقل ہوتی رہی یہاں تک کہ تین چار پشت اس طرح گذر گئی، اب اگر موجودہ قابضین جو اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہیں، اس زمین پر اپنی ملکیت کا دعویٰ پیش کرتے ہیں تو یہ کسی طرح قابل قبول نہ ہوگا۔ اس لیے کہ ان کے آباء و اجداد غلط طور پر اس پر قابض ہو گئے تھے۔

(۲) دوسری وہ جو کاشتکاروں کے قبضہ میں ہے اور یہ انھیں اپنے آباء و اجداد سے وراثۃً ملی ہے، لیکن اس زمین پر ان کے اجداد کا قبضہ قائم ہونے کی نوعیت یہ تھی کہ انھوں نے اصل کاشتکار یا مالک زمین کو زبردستی بے دخل کر کے اسے اپنے قبضہ میں کر لیا تھا۔ اس لیے اس نوع کی آراضی پر بھی موجودہ قابضین کا دعویٰ ملکیت بے بنیاد ہے۔

(۳) تیسری قسم ان زمینوں کی ہے جنھیں ابتدائی فتح کے وقت امام یا سلطان نے غانمین میں سے بعض کو یا کسی مستحق مسلمان (خواہ وہ عالم ہو یا غیر عالم) کو عطا کیا تھا اور اس سلطان کی اجازت سے اس کی کاشت کی یا امام کے ساتھ دارالحرب میں داخل ہونے والوں میں سے بعض نے کسی شہر کو فتح کیا اور امام نے اسے اس پر بخش دیا اور اس نے اس کی زراعت کا اہتمام کیا تو یہ زمینیں بلاشبہ عشری قرار پائیں گی اور ان لوگوں کی ملک میں داخل ہوں گی جنھیں عطا ہوئی تھیں[1]

---

[1] رسالہ در بیع آراضی، محولہ بالا، ورق ۱۰ ب